اقبال کی کہانی

جگن ناتھ آزاد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اقبال کی کہانی

جگن ناتھ آزاد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

پہلی اشاعت	:	1988
چھٹی طباعت	:	2010
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/10 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	594

Iqbal ki Kahani
by
Jagan Nath Azad

ISBN :978-81-7587-407-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ،
نئی دہلی-110025 فون نمبر49539000، فیکس49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر کے پورم، نئی دہلی-110066، فون نمبر26109746
فیکس نمبر26108159
ای-میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، 167/8، سونا پریا چیمبرس، جولینا، نئی دہلی-110025
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آ جاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آ جاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست مضامین

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

شیخ الجامعہ

کے نام

جو نئی نسل کی علمی، ادبی اور ذہنی تربیت کے لیے کوشاں ہیں

دو باتیں

پیارے بچو! اگر کوئی تم سے پوچھے کہ اردو کے دو بڑے شاعر کون ہیں تو تم غالباً جواب میں کہو گے "غالب اور اقبال" اور تمہارا جواب یقیناً صحیح ہوگا۔ غالب اور اقبال اردو کے دو ایسے نامور شاعر ہیں جن کی بدولت اردو زبان اور اردو شاعری کا نام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا ہے۔

غالب اور اقبال کی شاعری کو دنیا بھر میں اس قدر پسند کیا جاتا ہے کہ اکثر ملکوں میں ان کی نظموں اور غزلوں کے ترجمے لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکے ہیں۔ دراصل بڑا شاعر یا بڑا فن کار کسی ایک ہی ملک کا ہو کے نہیں رہ جاتا بلکہ وہ ساری دنیا کی محبوب شخصیت بن جاتا ہے جیسے شیکسپیئر، ملٹن، پشکن، حافظ، سعدی، فردوسی، کالی داس، تلسی داس، گوئٹے، دانتے وغیرہ۔

تمہیں یاد ہوگا کہ آج سے کچھ سال پہلے مرزا غالب کی صد سالہ برسی دنیا کے کئی ملکوں میں منائی گئی تھی۔ اِن ملکوں میں ہندوستان، پاکستان، روس، برطانیہ اور امریکہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اور اب تم یہ سن رہے ہو گے کہ اگلے برس یعنی ۱۹۷۷ء میں اردو کے دوسرے بڑے شاعر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ سالگرہ بھی ہندوستان کے علاوہ پاکستان، روس، برطانیہ، جرمنی، امریکہ، ایران اور ہر اُس ملک میں منائی جائے گی جہاں اردو اور فارسی پہنچ چکی ہیں۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اقبال اردو اور فارسی کے ایک نامور شاعر تھے لیکن شاعر ہونے کے

ساتھ ہی ساتھ وہ ایک عالمگیر شہرت رکھنے والے فلسفی بھی تھے۔ انھوں نے انگریزی میں فلسفے پر دو کتابیں لکھی ہیں جنھیں فلسفے کی دنیا میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔

جہاں تک مختلف زبانوں پر عبور کا تعلق ہے اقبال اردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور جرمن میں بھی مہارت رکھتے تھے، ہندی اور سنسکرت سے بھی آشنا تھے اور مختلف علوم اور فنون کی کتابیں ہر وقت ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔

لیکن اتنے بڑے عالم اور فلسفی ہونے کے باوجود وہ بہت ہی شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ان کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ہر شام کو ان کے یہاں احباب کی محفل جمتی تھی جس میں علمی اور ادبی بحثوں کے ساتھ ہی ساتھ لطیفوں کے چمن بھی کھلتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اقبال باتوں ہی باتوں میں علم و ادب کے ایسے نکتے اور اسرار کھولتے تھے جو بڑی موٹی اور ضخیم کتابیں پڑھنے کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکیں اور بعض دفعہ کوئی ایسا لطیفہ چھوڑ دیتے تھے کہ ساری محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔

اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے اقبال کو بڑی دلچسپی تھی۔ بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے انھوں نے ایسے مضامین بھی لکھے جنھیں پڑھ کر قوم بچوں کی بہبود کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے اور ایسی دلکش نظمیں بھی کہیں جنھیں بچے شوق سے پڑھ کر اور ان میں بیان کی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے اپنے ملک ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔

ہندوستان کے اس عظیم شاعر کے متعلق اردو، ہندی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، روسی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں متعدد کتابیں موجود ہیں لیکن اردو میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جو آسان اور دلچسپ زبان میں ہو اور جو بچوں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔ میں ترقی اردو بیورو کا ممنون ہوں کہ اِس ادارے نے یہ خدمت میرے سپرد کی۔ مجھے اردو جاننے والے بچوں کے لیے یہ کتاب لکھ کے دلی مسرت ہو رہی ہے اس لیے کہ اردو کے دوسرے ہزاروں

لاکھوں طلبا کی طرح اقبال میرا بھی محبوب شاعر ہے اور میں اپنے اس پسندیدہ شاعر کی سوانح حیات اور کلام کا انتخاب بچوں کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ بچے یہ کتاب شوق سے پڑھیں گے اور صرف یہی نہیں کہ اقبال کی شاعری کے ساتھ ان کی دلچسپی بڑھے گی بلکہ وہ اقبال کے کلام اور نثر کے مطالعے کے بعد اقبال کے ان خیالات کو پوری طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں گے جن میں گہرے معانی کی ایک کائنات آباد ہے ——— مجھے یقین ہے کہ ان خیالات کی بدولت جہاں ان کے دماغ علم کی روشنی سے منوّر ہوں گے وہاں ان کے دل دردِ انسان، دردِ وطن اور دردِ عالم کی دولت سے بھی مالا مال ہوں گے۔

جگن ناتھ آزاد

سری نگر

زندگی

آبا و اجداد

جموں و کشمیر کے گرمائی دارالحکومت سری نگر سے چند میل کے فاصلے پر چکّر نام کا ایک گاؤں تھا جس کے بچے کھچے نشانات آج بھی باقی ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی کی بات ہے اِس گاؤں میں بابا صالح نام کے ایک بزرگ رہتے تھے جن کی شرافت اور نیک نفسی کا دُور دُور تک چرچا تھا۔ اُن کی اولاد میں شیخ جمال الدین نے جو اقبال کے پردادا تھے غالباً اٹھارہویں صدی کے آخر میں بیوی بچوں سمیت کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں جو جموں و پنجاب کی سرحد پر واقع ہے سکونت اختیار کی۔

شیخ جمال الدین کے فرزند کا نام شیخ محمد رفیق تھا۔ کشمیری رواج کے مطابق وہ رفیقا کے نام سے مشہور تھے۔ کشمیری دُھسوں کی تجارت اُن کا کاروبار تھا۔ ان کے تین صاحبزادے تھے جن کے نام تھے شیخ نور محمد، شیخ غلام قادر اور شیخ غلام محمد۔ شیخ نور محمد جنہیں عرفِ عام میں شیخ نتھو کہا جاتا تھا عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ یوں تو بڑی حد تک زیورِ علم سے عاری تھے لیکن قدرت نے انہیں سوچ بچار اور غور و فکر کی وہ دولت عطا کی تھی جس کی بدولت وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں "اَن پڑھ فلسفی" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عالموں اور صالح لوگوں کی صحبت میں بسر ہوتا تھا۔

شیخ نور محمد کی اولاد پانچ لڑکے لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ بڑے لڑکے کا نام شیخ عطہ
کا محمد اقبال جن کی داستانِ حیات اِس کتاب میں سنائی جا رہی ہے۔ اِن کے
تھیں جن کا کم عمری میں انتقال ہو گیا تھا۔

بچپن، تعلیم اور تربیت

اقبال ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ سیال کوٹ پاکستان کی سرحد پر ریاست جموں و کشمیر سے ملحق ہے ایک بارونق شہر ہے۔ اس زمانے میں بھی ایک اچھا خاصا صنعتی شہر تھا۔

اقبال کے والد کوئی امیر آدمی نہیں تھے لیکن چونکہ علم کا احساس و دماغ رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اقبال کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ اقبال خود بھی بہت ذہین تھے اڑوس پڑوس کے بچوں سے کہیں زیادہ ذہین۔ اپنی پڑھائی سے انھیں بڑی رغبت اور آوارہ گردی یا کسی اور طرح وقت ضائع کرنے سے نفرت تھی۔

اُس زمانے میں سیال کوٹ علم و ادب کا مرکز تھا اور یہاں کئی عالم و فاضل شخصیتیں موجود تھیں۔ اِن سب میں ممتاز شخصیت مولانا سید میر حسن کی تھی۔ تعلیم و تربیت کے لیے شیخ نور محمد نے اپنے بیٹے اقبال کو انھیں سید میر حسن کے سپرد کیا۔ استاد شاگرد کا یہ تعلق ساری عمر قائم رہا۔ اقبال کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ جب تک زندہ رہے اپنے استاد کے گُن گاتے رہے۔ اپنی ایک غزل میں سید میر حسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

۱۹۲۲ء میں اقبال کو جب حکومت برطانیہ نے سر کا خطاب پیش کرنا چاہا اور پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن نے اس سلسلے میں اُن کے ساتھ بات کی تو آپ نے کہا کہ جب تک میرے

اُستاد مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب نہیں دیا جاتا میں سر کا خطاب قبول نہیں کروں گا۔ ایڈورڈ میکلیگن اِس جواب سے پریشان ہوئے اور بولے کہ سید میر حسن نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اِس لیے انھیں شمس العلما کا خطاب دینا دشوار ہے۔ اقبال نے فوراً کہا کہ "اُن کی زندہ کتاب میں ہوں اِس سے بڑھ کے آپ اور کون سی کتاب چاہتے ہیں؟" سر ایڈورڈ میکلیگن اِس جواب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً اقبال کا مطالبہ حکومت برطانیہ تک پہنچایا۔ چنانچہ جب اقبال کو سر کا خطاب ملا تو ساتھ ہی حکومت نے مولوی میر حسن کو بھی شمس العلما کا خطاب دیا۔

اسکاچ مشن کالج

اُنہی دنوں اسکاچ مشن اسکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں کھلیں اور وہ کالج بن گیا۔ چنانچہ اقبال میٹریکولیشن پاس کرنے کے بعد اسی کالج کی انٹرمیڈیٹ کلاس میں داخل ہوئے۔ مولوی میر حسن بھی کالج کے طلبا کو پڑھانے پر مامور ہوئے اور اُستاد شاگرد کا باہمی تعلق بدستور قایم رہا۔

شاعری کی ابتدا

اس زمانے میں اقبال کی شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی اور وہ سیال کوٹ کے ایک چھوٹے سے مشاعرے میں جو باقاعدگی سے منعقد ہوتا تھا کبھی کبھار شریک ہو کے اپنا کلام سُنایا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی چند غزلیں اصلاح کے لیے فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کو بھیجیں جو اُس زمانے میں حیدر آباد میں تھے۔ داغ نے بہت جلد اقبال کو یہ لکھا کہ تمہارا کلام بڑی حد تک اصلاح سے بے نیاز ہے، مطالعہ اور مشقِ سخن جاری رکھو۔ اُستاد داغ نے چند ہی غزلوں سے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ داغ کی زندگی ہی میں اقبال کو ملک گیر شہرت اور ناموری حاصل ہو گئی اور اُستاد شاگرد پر اور شاگرد اُستاد پر ہمیشہ فخر کرتا رہا۔

اقبال لاہور میں

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد اقبال لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج میں آپ نے بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ انگریزی، فلسفہ اور عربی آپ کے مضامین تھے۔ ۱۸۹۷ء میں آپ نے بڑے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ انگریزی اور عربی میں آپ یونیورسٹی بھر میں اول آئے اور وظیفہ حاصل کرنے کے علاوہ آپ نے دو طلائی تمغے بھی انعام میں پائے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آپ ایم۔ اے میں داخل ہوئے۔ فلسفے کے ساتھ آپ کو خاص لگاؤ تھا اس لیے ایم۔ اے میں آپ نے فلسفے ہی کو اپنے مضمون کے طور پر اختیار کیا۔ خوش قسمتی سے استاد بھی آپ کو ایسا ملا جس کی دنیائے فلسفہ میں دور دور تک شہرت تھی۔ یہ تھے پروفیسر ٹامس آرنلڈ جو بعد میں سر ٹامس آرنلڈ ہو گئے تھے۔ ٹامس آرنلڈ اپنے شاگرد اقبال کی قابلیت سے ایسے متاثر ہوئے کہ بہت جلد استاد اور شاگرد میں دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ چنانچہ آرنلڈ جب گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہو کے انگلستان چلے گئے تو اقبال کو ان کی جدائی بے حد شاق گزری اور انھوں نے اپنی اس دلی کیفیت کا اظہار ایک نظم "نالۂ فراق" میں کیا۔

۱۸۹۹ء میں آپ نے ایم۔ اے کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ یونیورسٹی بھر میں آپ پھر اول آئے اور پھر ایک طلائی تمغہ انعام میں پایا۔

لاہور میں مشاعرہ

یوں تو اقبال کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اور اسکول کے زمانے ہی میں انکی شاعری

کا آغاز ہو گیا تھا لیکن لاہور کی فضا میں ان کی شاعری کو پھولنے پھلنے کے جو مواقع ملے وہ سیالکوٹ میں شاید میسر نہ آتے۔

لاہور اُنیسویں صدی کی آخری دہائی میں شعر و ادب کا مرکز تھا۔ گوشے گوشے میں مشاعرے منعقد ہو رہے تھے لیکن اقبال اپنی خلوت پسندی کے باعث اِن مشاعروں سے دُور دُور رہتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے احباب انھیں مجبور کر کے ایک مشاعرے میں لے گئے۔ یہ مشاعرہ باقاعدگی سے بھاٹی دروازے کے اندر حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم حسین ناظم لکھنوی اس مشاعرے کے روحِ رواں تھے۔ یہ دونوں اور ان کے شاگرد اس مشاعرے میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ بعض دفعہ یہ مشاعرہ ایک ادبی اکھاڑہ بن جاتا تھا جس میں دِلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول ایک دوسرے کے مقابلے میں خم ٹھونک کے آ جاتے تھے۔

اقبال نے اِس مشاعرے میں اپنی غزل خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا شروع کی تو اہلِ مجلس پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور جب وہ اِس شعر پر پہنچے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو ارشد گورگانی نے بے انتہا داد دی اور بول اُٹھے "اقبال! اس عمر میں یہ شعر!" اس کے بعد جب اقبال نے دِلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے باہمی مقابلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غزل کا مقطع پڑھا ؎

اقبال لکھنؤ سے نہ دِلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

تو گویا انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

انجمنِ حمایتِ اسلام

اِس غزل سے اقبال کی شہرت صرف لاہور کے گوشے ہی میں نہیں بلکہ لاہور سے باہر بھی پھیل گئی اور اہلِ لاہور نے انھیں مجبور کیا کہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوں اور وہاں اپنا کلام سنائیں۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں انھوں نے انجمن کے اجلاس میں اپنی نظم "نالۂ یتیم" پڑھی جس کی داد سننے والوں نے آنسوؤں اور آہوں سے دی۔

اس نظم سے ملک کے ادبی ماحول میں اقبال کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہوگئی، اور ان سے تقاضا ہونے لگا کہ انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں جو ایک مذہبی جماعت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک عظیم الشان علمی اور ادبی ادارہ بھی تھا اپنی نظمیں پڑھیں۔ چنانچہ انھوں نے اگلے برس پھر ایک نظم "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" کے عنوان سے انجمن کے اجلاس میں سنائی۔

اس کے بعد تو یہ سلسلہ ایسا قایم ہوا کہ اقبال نے اپنی اکثر بلند پایہ نظمیں انجمن ہی کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں۔

ہمالہ

۱۹۰۱ء میں شیخ سر عبدالقادر نے لاہور سے ماہنامہ "مخزن" جاری کیا۔ اس میں اقبال کی وہ مشہور نظم شایع ہوئی جو "بانگِ درا" کی سب سے پہلی نظم ہے "ہمالہ"۔ اس نظم کے چھپتے ہی اقبال کی شہرت پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور مختلف رسالوں، اخباروں اور مجلسوں سے اقبال کو نظموں کے لیے فرمائشیں آنے لگیں لیکن اقبال نے اپنا کلام نہ زیادہ رسائل اور اخبارات کو بھیجا اور نہ ہی زیادہ محفلوں میں شریک ہوئے شہرت اور ناموری خود اُن کے پیچھے پیچھے پھرتی رہیں۔

اقبال کی پہلی تصنیف

جس سال اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اسی سال یعنی ۱۹۰۳ء میں ان کی پہلی تصنیف شائع ہوئی۔ پیارے بچو! تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ کتاب نہ ان کے کلام کا مجموعہ تھا نہ فلسفے پر کوئی کتاب تھی بلکہ یہ اقتصادیات کے موضوع پر ایک کتاب تھی۔ اسی سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ مختلف علوم پر انھیں کتنی دسترس حاصل تھی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اس کے اگلے برس ان کے قلم سے ایک ایسی نظم نکلی جو مدتوں تک ہندوستان کے قومی ترانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور آج بھی جن گن من اور بندے ماترم کے بعد یہی وہ نظم ہے یعنی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" جو ہندوستان کے اکثر اسکولوں اور ادبی اور سیاسی مجلسوں میں قومی ترانے کے طور پر گائی جاتی ہے۔ یہ نظم تم نے اپنی درسی کتابوں میں پڑھی بھی ہوگی اور اپنے اسکول میں گائی بھی ہوگی اور ممکن ہے تمہیں زبانی بھی یاد ہو۔

یورپ میں تین سال

اقبال کا علم اور کتابوں کے ساتھ وہی تعلق تھا جو ایک پیاسے انسان کا ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے سے ہوتا ہے۔ اُن کی علم کی پیاس کبھی بجھتی ہی نہیں تھی۔ علم حاصل کرنے کی یہی خواہش انھیں یورپ کی یونیورسٹیوں تک پہنچنے کے لیے اُکساتی رہی۔ آخر ایک دن اُن کی یہ خواہش پوری ہو کر رہی اور وہ ستمبر ۱۹۰۵ء میں ہندوستان سے یورپ روانہ ہو گئے۔ لاہور سے چل کے وہ پہلے دہلی رُکے اور حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر پہنچ کر دعا مانگی۔ یہ ایسی دعا ہے جو ہر وقت ہر انسان کی زبان پر رہنی چاہیے۔ اس دعا میں آپ حضرت محبوب الٰہیؒ سے یوں خطاب کرتے ہیں۔ ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شراب علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ ہے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

کیمبرج یونیورسٹی میں

دہلی سے چل کے اقبال بمبئی پہنچے اور بمبئی سے سمندری جہاز کے ذریعے انگلستان وہاں پہنچتے ہی انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی کے ٹرنیٹی کالج میں داخلہ لیا۔ کیمبرج سے آپ جب بھی لندن آتے تو اپنے بعض دوستوں کے ہمراہ جن میں مرحوم حافظ محمود شیرانی (اختر شیرانی کے والد) اور جناب عبداللہ سہروردی کے ساتھ جنھیں بعد میں سر کا خطاب ملا، ۱۹ ایڈورڈس روڈ نمبر ۲ (شمالی لندن) میں قیام کرتے تھے۔ بچو! جب بڑے ہو کر تم کبھی انگلستان جاؤ تو اس مکان کو ضرور دیکھنا یہ مکان ہم ہندوستانیوں کے لیے اقبال اور حافظ محمود شیرانی کے تعلق سے ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہاں تو ہم کیمبرج یونی ورسٹی کی بات کر رہے تھے۔ اقبال کے پرانے اُستاد ٹامس آرنلڈ بھی اسی یونی ورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر میکٹیگرٹ جو سنت فلسفی کے نام سے مشہور تھے اسی یونی ورسٹی میں فلسفہ پڑھانے پر مامور تھے۔ پروفیسر وہایٹ ہیڈ جیسے نامی گرامی پروفیسر بھی یہیں تھے۔ اقبال نے ان تینوں اُستادوں سے بہت کچھ سیکھا۔

"فلسفۂ عجم"

یہیں اقبال نے فیصلہ کیا کہ انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ایران کے فلسفے پر ایک مقالہ لکھنا چاہیے۔ مذکورہ اساتذہ اور فارسی کے اُستاد پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن سے مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ اقبال اپنا مقالہ میونک یونی ورسٹی (جرمنی) میں پیش کریں۔ چنانچہ اقبال اس مقالے کو مکمل کرنے کے لیے میونک پہنچے۔ وہاں ڈھائی تین برس تک آپ نے اس مقالے پر سخت محنت کی اور جب یہ مقالہ انھوں نے میونک یونی ورسٹی میں پیش کیا تو یونی ورسٹی نے اس پر اقبال کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس مقالے کی تعریف میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسی مقالے پر یونیورسٹی آف کیمبرج نے اقبال کو ایک امتیازی سرٹیفیکیٹ عطا کیا۔

ہندوستان کو واپسی

یورپ میں تین برس قیام کرنے کے بعد اقبال ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، بیرسٹرایٹ لاہوکر وطن واپس آئے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر دوستوں اور مداحوں کے ایک بھاری ہجوم نے ان کا استقبال کیا اور کئی رسالوں اور اخباروں نے استقبالیہ نوٹ اور اداریے لکھے۔

کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر شعبۂ فلسفہ پروفیسر جیمز کا انتقال ہوگیا۔ پرنسپل مسٹر رابسن نے یہ عہدہ اقبال کو پیش کیا۔ اقبال نے جواب میں کہا کہ میں چیف کورٹ میں وکالت جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ پرنسپل رابسن اس بات پر مُصر تھے کہ اقبال انکی پیش کش قبول کرلیں اور چیف کورٹ کے حکام یہ چاہتے تھے کہ اقبال چیف کورٹ میں پریکٹس جاری رکھیں۔ بالآخر محکمۂ تعلیم اور چیف کورٹ کے حکام نے مل جل کر یہ فیصلہ کیا کہ اقبال صبح کو کالج میں پروفیسری اور اس کے بعد چیف کورٹ میں پریکٹس کریں۔ چنانچہ اس بات کی حکومت سے باقاعدہ اجازت لے لی گئی اور طے یہ پایا کہ چیف کورٹ میں اقبال کے مقدمات اُس وقت پیش ہوں جب وہ کالج سے فارغ ہوکر کورٹ میں پہنچ جائیں۔

گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ

اقبال نے گورنمنٹ کالج میں کوئی ڈیڑھ سال فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اچانک استعفیٰ دے دیا۔ آپ جب استعفیٰ دے کر گھر آتے تو اُن کے ملازم علی بخش نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے اس قدر اعلیٰ عہدے سے بغیر وجہ کے کیوں

استعفیٰ دے دیا۔ اقبال نے کہا علی بخش! گورنمنٹ کالج کی پروفیسری ایک طرح کی پابندی ہے۔ میں آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور اس عہدے پر رہ کر ان خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اظہارِ خیالات کی آزادی کے لیے اس عہدے سے مستعفی ہونا ضروری تھا۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک

۱۹۱۰ء میں مشرقِ وسطیٰ نے ایک بھیانک جنگ دیکھی۔ بلقان اور طرابلس کے ہنگاموں نے اسلامی ممالک کو لہولہان کر دیا۔ اقبال کا دل اس صدمے سے تڑپ اٹھا۔ ان کی نظم "شہدائے طرابلس" اسی جنگ کی یادگار ہے۔ اب یہ نظم حضور رسالت مآب میں" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہے۔

اس زمانے میں اقبال نے ملک پر نظموں کا مینہ برسا دیا۔ مغربی ممالک اسلامی ملکوں کے ساتھ جو نامناسب سلوک روا رکھ رہے تھے۔ اقبال نے اس کے خلاف نظم و نثر میں آواز بلند کی۔ اسی زمانے میں برطانیہ ہندوستان پر اپنی حکومت کے شکنجے کو سخت سے سخت تر کیے چلا جا رہا تھا۔ اقبال نے اپنی آگ بھری شاعری سے برطانیہ کی اس کوشش پر بھی کاری ضرب لگائی اور دوسرے مغربی ملکوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف بھی اپنے قلم کو استعمال کیا۔

۱۹۱۹ء میں انگریزی حکومت نے جب جلیانوالہ باغ امرتسر میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور نہتے ہندوستانی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو اپنی گولیوں سے بھون ڈالا تو اقبال نے یہ قطعہ کہا ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ ۔۔۔ غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم ۔۔۔ تُو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

والدہ کا انتقال

۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ محترمہ بیگم امام بی بی کا انتقال ہوا۔ اقبال کو اس کا بے حد صدمہ ہوا اور وہ مدت تک افسردہ خاطر رہے۔ شفیق ماں کی دائمی جدائی پر آپ نے جو مرثیہ لکھا وہ دنیا بھر کے ادب میں ایک بلند مرتبے کا حامل ہے۔

اسرار خودی اور رموز بے خودی

اگلے برس آپ کی پہلی شاعرانہ تصنیف مثنوی "اسرار خودی" منظر عام پر آئی۔ اس کتاب نے فارسی کے ایک مستند شاعر کے طور پر اقبال کی شہرت افغانستان اور ایران تک پہنچا دی۔ ۱۹۱۸ء میں اس کتاب کا دوسرا حصہ "رموز بے خودی" کے نام سے شائع ہوا۔

ملالت کی ابتدا

۱۹۱۷ء میں اقبال کی صحت کو پہلی بار دھچکا لگا جب کہ وہ درد گردہ میں مبتلا ہوئے۔ گیارہ برس بعد ۱۹۲۸ء میں پھر اس مرض نے آ دبوچا اور درد کی شدت سے وہ قریب قریب نڈھال ہو گئے۔ اقبال اس زمانے میں کسی قدر ورزش کے عادی تھے اور بظاہر ان کے پٹھے مضبوط تھے لیکن درد کا حملہ بہت شدید تھا اور اس نے انھیں تڑپا دیا۔

کانگریس کے مشہور لیڈر اور آریہ سماج کے رہنما لالہ لاجپت رائے اقبال کی عیادت کو آئے تو انھیں مشورہ دیا کہ وہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھائی حکیم عبدالوہاب انصاری سے جو "حکیم نابینا" کے نام سے مشہور تھے علاج کرائیں۔ چنانچہ اقبال علاج کی غرض سے دہلی تشریف لے گئے۔

اقبال اور کشمیر

پیارے بچو! اقبال ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اقبال کا کشمیر کے ساتھ تعلق محض یہیں تک ہی محدود تھا بلکہ بہت دور تک پہنچتا تھا۔

اقبال ابھی بی اے میں پڑھتے تھے کہ انھوں نے کشمیر کے متعلق چند قطعات کہے تھے ان میں سے چار قطعات نیچے درج کیے جا رہے ہیں:-

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے
اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا! کیا محفلِ احباب ہے
ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

سو تدابیر کی اے قوم! یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے
جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گہِ مولائے جلیل
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغِ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

اس کے بعد بھی ۱۹۳۰-۳۱ء میں کشمیر کی تحریکِ آزادی کے ساتھ اقبال کا گہرا تعلق رہا۔

پیامِ مشرق اور بانگِ درا

۱۹۲۳ء میں اقبال کا دوسرا فارسی مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" شائع ہوا۔ یہ مجموعۂ کلام اقبال نے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے مجموعۂ کلام "دیوانِ مغرب" کے جواب میں لکھا تھا۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں وہ کتاب شائع ہوئی جو اقبال کا مقبول ترین مجموعۂ کلام کہی جاتی ہے اور جو اس وقت تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ یہ کتاب ہے "بانگِ درا"۔ اردو کی شاید ہی کوئی لائبریری یا پڑھا لکھا گھرانا ایسا ہو جس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔

جاوید اور منیرہ

اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء میں جاوید اقبال پیدا ہوا جس سے اقبال کو ہمیشہ انتہائی محبت رہی۔ جاوید کے نام اقبال کی نظمیں اُن کے اردو کلام میں موجود ہیں۔ فارسی میں ایک طویل مثنوی جاوید کے نام پر ہے اور اس کا نام ہے "جاوید نامہ"۔ منیرہ جاوید کی بہن ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئی۔

جاوید اقبال نے بھی لندن سے بیرسٹرایٹ لا، کا امتحان پاس کیا۔ آپ ایک اچھے نثر نگار ہیں۔ چند ایک ڈرامے بھی آپ نے لکھے ہیں۔ آپ پنجاب (پاکستان) ہائی کورٹ کے جج ہیں اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں۔

منیرہ کی بھی شادی ہو چکی ہے وہ بھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کراچی میں ہے۔

پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں

ہندوستان اور دنیا کے سیاسی حالات اقبال کو سیاست کے خارزار میں گھسیٹ کر لے گئے۔ دوستوں نے انھیں کونسل کا انتخاب لڑنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ اپنی مرضی کے خلاف اِس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ کو اپنے مخالف کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ووٹ ملے چنانچہ آپ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔

زبورِ عجم

۱۹۲۷ء میں "زبورِ عجم" شائع ہوئی۔ اسی سال اقبال کو مدراس کی ایک علمی اور ادبی جماعت کی طرف سے دعوت ملی کہ آپ اسلام کے موضوع پر یہاں آکر لیکچر دیں۔ اقبال نے یہ دعوت منظور کر لی اور آیندہ برس مدراس پہنچ کر انھوں نے چھ لیکچر دیے۔ یہی لیکچر انھوں نے بعد میں مہاراجہ میسور کی دعوت پر میسور میں بھی دیے۔ ان میں سے بعض لیکچر انھوں نے حیدر آباد اور علی گڑھ میں بھی دیے۔

۱۹۳۰ء میں ان کے والد محترم شیخ نور محمد کا انتقال ہوا۔ عام خیال یہ ہے کہ "ضربِ کلیم" میں "مردِ بزرگ" کے عنوان سے جو اشعار ہیں وہ اقبال نے اپنے والد محترم کے انتقال پر کہے تھے۔

گول میز کانفرنس میں شرکت، واپسی اور علالت

۱۹۳۱ء میں اقبال دوبارہ یورپ تشریف لے گئے۔ یہ سفر دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں تھا۔ واپسی پر پیرس میں انھوں نے مشہور یہودی اسکالر ہسپانیہ اور ویانا کے نامور فلسفی برگساں سے ملاقات کی۔

یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو آپ واپس لاہور تشریف لائے۔ اگلے برس ان کا فارسی شاہکار "جاوید نامہ" شائع ہوا جس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

یورپ کا تیسرا سفر

۱۹۳۲ء میں آپ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے پھر لندن روانہ ہوئے۔ لندن سے واپسی پر آپ نے روم میں مسولینی سے ملاقات کی۔ اسی سفر میں آپ اسپین بھی گئے جہاں آپ نے مسجد قرطبہ کی زیارت کی اور اس میں اذان دی۔

سفر افغانستان

۱۹۳۳ء میں آپ لاہور واپس تشریف لائے۔ اسی سال آپ حکومت افغانستان کی دعوت پر کابل گئے۔ سفر کا مقصد یہ تھا کہ حکومت افغانستان اپنے ملک کے لیے تعلیمی نظام کا نقشہ ہندوستان کے مسلمان علما سے تیار کرانا چاہتی تھی۔ اس سفر میں سید سلیمان ندوی

مرحوم اور سر راس مسعود مرحوم بھی اقبال کے ہمراہ تھے۔ اقبال نے اس سفر کے تاثرات ایک مثنوی "مسافر" میں بیان کیے ہیں۔

والدہ جاوید کا انتقال

سفرِ افغانستان سے واپسی پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔

ایک آدھ برس سے اقبال کی صحت گرتی چلی آ رہی تھی۔ جنوری ۱۹۳۴ء کی بات ہے آپ شاہی مسجد میں عید کی نماز پڑھنے گئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ انھیں ننگے پاؤں مسجد کے صحن میں آنا جانا پڑا۔ واپس آئے تو گرم سویّاں دہی ملا کے کھائیں۔ شدید نزلے اور کھانسی میں مبتلا ہو گئے۔ گلا بھی بیٹھ گیا اور حقیقت میں یہاں سے اُن کی اُس طویل علالت کا آغاز ہوا جو چار برس بعد جان لیوا ثابت ہوئی۔

اقبال کی بیگم یعنی والدہ جاوید مدت سے بیمار چلی آتی تھیں۔ اپریل میں انھیں میعادی بخار نے آگھیرا۔ جو انجام کار ۲۳ مئی کو ان کی جان لے کر ٹلا۔ اقبال پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ۲۴ مئی کو انھوں نے ایک خط میں لکھا:۔

> "کل شام والدہ جاوید اس جہان سے رخصت ہو گئیں۔ اُن کے آلام و مصائب اور میرے اطمینانِ قلب کا خاتمہ ہوا۔ اللہ فضل کرے۔۔۔۔"

بالِ جبریل

اسی سال اُن کا نیا مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" شائع ہوا۔ اس سے آمدنی ضرور ہوئی۔ کتابوں سے آمدنی پہلے بھی خاصی ہوتی تھی لیکن یہ سارا روپیہ جاوید منزل کی تعمیر پر صرف ہو چکا تھا۔ یہ زمانہ اقبال کے لیے مالی اعتبار سے خاصا مشکل زمانہ تھا۔ ایسے وقت میں

نواب بھوپال اور سر آغا خان نے پانچ پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ کی پیش کش کی۔ اقبال نے نواب بھوپال کی پیش کش قبول کر لی اور یہ کہہ کر کہ میرا خرچ پانچ سو روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ سر آغا خان کی پیش کش شکریے کے ساتھ نامنظور فرمائی۔ روپے پیسے سے بے نیازی اقبال کے مزاج کا ایک نمایاں پہلو تھا۔

بھوپال کا سفر

بھوپال کے وزیر تعلیم مرحوم سر راس مسعود کے ساتھ اقبال کو دلی محبت تھی۔ سر راس مسعود بھی اقبال اور اُن کی شاعری پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی دعوت پر اقبال ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک کئی مرتبہ علاج کے لیے بھوپال گئے۔ یہاں ان کا برقی علاج کیا گیا لیکن گئی ہوئی آواز واپس آئی اور نہ گئی ہوئی صحت۔

اس دوران میں حکیم نابینا صاحب کا علاج بھی جاری رہا۔ صحت میں کبھی کبھار افاقہ ہوتا رہا لیکن مجموعی طور پر صحت گرتی ہی چلی گئی۔

۱۹۳۵ء ہی میں انھوں نے اپنا وصیت نامہ تیار کیا۔ اگلے برس ان کی دو کتابیں "ضرب کلیم" اور "مسافر مع پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" شائع ہوئیں۔

آخری سفر

۱۹۳۶ء کے آخر میں اقبال کو گردے کے شدید دورے شروع ہو گئے تھے۔ اگلے سال آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا لیکن عام صحت چونکہ اچھی نہیں تھی اس لیے اس کا آپریشن ملتوی ہوتا چلا گیا۔ آواز کی تکلیف بھی بدستور تھی۔ ساتھ ہی گردے کے درد نے تیسری بار حملہ کیا۔ اس دوران میں ایلوپیتھک علاج بھی ہوتا رہا اور یونانی بھی۔

یہ کیفیت دو برس تک جاری رہی۔ ۲۰ اپریل کو بلغم میں خون نمودار ہوا۔ اس وقت علاج لاہور کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کرنل امیر چند کے ہاتھ میں تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ان کے نائب تھے۔ کرنل امیر چند بلغم میں خون کی اطلاع پاتے ہی فوراً آئے۔ معائنہ کیا اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو ہدایات دے کر چلے گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے دوا منگوائی لیکن اقبال وہ دوا پی نہ سکے۔ انھیں ایلوپیتھک دوائیں پسند نہیں تھیں۔

اُس روز اقبال کی طبیعت بہت خراب رہی۔ رات کو دیر تک وہ سو نہ سکے۔ ایک بجے کے قریب اُن کی آنکھ لگ گئی لیکن تین بجے وہ درد کی شدت سے بے تاب ہو کر جاگ اٹھے اور بولے حکیم صاحب کو بُلا لاؤ۔ اُن کی مرادِ حکیم قرشی سے تھی لیکن اس سے پہلے کہ حکیم صاحب آتے اقبال کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون!

انتقال سے قبل ان کی وہ فارسی رباعی ان کی زبان پر تھی جو انھوں نے چند ماہ قبل کہی تھی اور جس کا مفہوم یہ ہے:

"کیا عجب گیا ہوا لمحہ واپس آتا ہے یا نہیں
حجاز کی نسیم دوبارہ آتی ہے یا نہیں
اِس فقیر کا زمانہ تو ختم ہو چکا
کیا خبر اب دوبارہ کوئی رازوں کو جاننے والا آتا ہے یا نہیں"

موت کے بعد

اقبال کے انتقال کی خبر بجلی کی سُرعت کے ساتھ تمام شہر میں پھیل گئی اور جاوید منزل پہنچنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر اور دوسرے ادارے بند ہو گئے۔ سارا شہر ایک ماتم کدہ بن گیا۔

شام کے پانچ بجے جاوید منزل سے جنازہ اٹھا جلوس کے ساتھ پچاس ساٹھ ہزار افراد بلا لحاظِ مذہب و ملّت شریک تھے۔ سات بجے جلوس شاہی مسجد پہنچا۔ آٹھ بجے نمازِ جنازہ ادا ہوئی اور دس بجے کے قریب وہ عظیم شخصیت شاہی مسجد کے بائیں جانب ایک چھوٹے سے سبزہ زار میں سپردِ خاک کر دی گئی جس کے افکار کے لیے ساری دنیا کی وسعت تنگ نظر آتی تھی۔

جواہر لعل نہرو کا اظہارِ غم

اقبال کی موت پر ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی شخصیتوں نے جن الفاظ میں اپنے درد و غم کا اظہار کیا اور اخبارات و جرائد نے جو کچھ لکھا اگر انھیں جمع کیا جائے تو کئی دفتر مرتب ہو سکتے ہیں۔

جواہر لعل نہرو اس زمانے میں کانگریس کے صدر تھے انھوں نے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار اِن لفظوں میں کیا:

"میں نے انتہائی درد و الم کے ساتھ سر محمد اقبال کے انتقال کی خبر سنی ہے۔ ابھی تھوڑی ہی مدت کی بات ہے کہ جب وہ بسترِ علالت پر تھے میں نے اُن کے ساتھ ایک طویل بات چیت کی تھی۔ ان کی ذہانت اور آزادیِ ہند کے ساتھ ان کی محبت سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ ان کی موت سے افقِ ہندوستان پر ایک روشن اور تابناک ستارہ غروب ہو گیا ہے لیکن ان کی عظیم الشان شاعری ان کی یاد کو آنے والی نسلوں کے دلوں میں زندہ رکھے گی اور انھیں متاثر کرتی رہے گی۔"

شاعری پر ایک نظر

اقبال کی شاعری میں غزل، مثنوی، مسدس، مرثیہ، قصیدہ، قطعہ، رُباعی، تضمین، گویا ہر طرح کی اصنافِ سخن ملتی ہیں۔ ان میں وطنی شاعری بھی ہے اور مذہبی بھی۔ فلسفیانہ شاعری بھی ہے اور ظریفانہ کلام بھی۔ منظر نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور جذبات نگاری کے بھی۔ الفاظ کا حسن، تشبیہ اور استعارہ کا نیا پن، لطیف لب و لہجہ، خیال میں اونچ اور گہرائی، تخیل کی بلندی، بیان میں نغمگی اور ترنم کلامِ اقبال کی چند خصوصیتیں ہیں۔

بنی نوعِ انسان کی محبت

اقبال کی شاعری ایک درد بھرے دل کی شاعری تھی۔ انسانوں سے محبت کرنے والے انسان کی شاعری تھی، چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

قرآن اور رسول سے اقبال کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی اور اس محبت نے اقبال کے دل پر یہ حقیقت روشن کی کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی مخلوق ہے اور اس میں ہر شخص کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش آنا چاہیے۔ چنانچہ اقبال نے ساری عمر اسی نظریے کی تعلیم دی۔ "جاوید نامہ" میں ایک جگہ کہتے ہیں :

"بُرا لفظ زباں پر لانا خطا ہے

کافر ہے یا مومن، یہ سب خدا کی مخلوق ہیں

آدمیت سے کیا مراد ہے؟ آدمی کا احترام کرنا۔

تُو آدمی کے مقام سے باخبر ہوجا"

اقبال کی اس محبت کے دائرے میں افراد بھی آتے ہیں، سماج بھی، وطن بھی اور ساری دنیا بھی۔ چنانچہ اپنی نظموں میں کہتے ہیں ؎

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اور

؎ ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید اُنھیں جگا دے

دراصل اقبال کا دل ایک دیوانِ عام تھا جس میں بچوں کی، بڑوں کی، ساتھیوں کی، وطن کی، اسلام کی اور دنیا بھر کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ یہ دیوانِ خاص نہیں تھا جس میں کسی کی جگہ ہو اور کسی کی نہ ہو۔

شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور لطیفے

علامہ اقبال دنیا کے ایک مانے ہوئے مفکر اور فلسفی ہونے کے باوجود ایک نہایت ہی خوش طبع اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے تھے اسے اپنی شگفتہ بیانی اور بذلہ سنجی سے قہقہہ زار بنا دیتے تھے۔

بات میں بات پیدا کرنا آپ کا خاص کمال تھا۔ نہایت باریک علمی اور ادبی نکتوں کو وہ اکثر لطایف کی صورت میں یوں بیان کر دیتے تھے کہ بات بے اختیار دل میں اُتر جاتی تھی۔ ان کی حاضر جوابی بھی غضب کی کیفیت رکھتی تھی۔

ڈبلیو۔ اے۔ ہیڈ

فقیر سید نجم الدین سے اقبال کی بڑی دوستی تھی اور ان کے گھر وہ اکثر جایا کرتے تھے۔ سید افتخار الدین کے فرزند سید وحید الدین اُس زمانے میں ابھی کم عمر لڑکے تھے۔ وہ اقبال کے علم و فضل سے تو واقف نہ تھے اتنا جانتے تھے کہ یہ ان کے والد کے دوست ہیں اور حال ہی میں انگلستان سے واپس آئے ہیں۔ نہ جانے انھیں کیا سوجھی، ایک دن اقبال سے کہنے لگے "چچا! انگلستان جاکر لوگ اپنے نام انگریزی طریقے سے رکھ دیتے ہیں۔ آپکو چاہیے تھا کہ آپ اپنا نام وہاں A K Bammer رکھ لیتے۔" اقبال نے فوراً جواب دیا کہ "بھئی ہم سے تو یہ نہ ہو سکا جب تم انگلستان جاؤ تو اپنا نام W. A Head رکھ لینا۔" وحید الدین اس وقت

سے کھسیانے ہو گئے اور وہاں سے کوئی بہانہ کرکے اُٹھ گئے۔

اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے

لڑکپن کے دن تھے۔ اقبال ایک روز اسکول تاخیر سے پہنچے۔ اُستاد نے دیر میں آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب میں کہا "اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے۔"

چھوٹے میاں کا شعر

نواب سر ذوالفقار علی خاں اور علامہ اقبال میں گہری دوستی تھی۔ دونوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تھا۔ نواب سر ذوالفقار علی کی کوٹھی میں یوکلپٹس کے درخت تھے جن میں سے گوند نکلا کرتی تھی۔ ان کے فرزند نوابزادہ خورشید علی خاں کم سن تھے ان کی عمر کوئی نو دس برس کی ہوگی۔ درختوں میں سے گوند جمع کرنا ان کا دن بھر کا مشغلہ تھا۔ اقبال انھیں چھوٹے میاں کہا کرتے تھے۔

ایک دن اقبال جب ذوالفقار علی خاں کے ہاں گئے تو خورشید علی خاں کو بلا کر پوچھنے لگے "چھوٹے میاں! کیا کر رہے ہو؟" وہ بولے "درخت سے گوند نکال رہا ہوں۔" اقبال نے فوراً کہا۔ ع

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

چند روز بعد پھر اقبال کے پوچھنے پر کہ "چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو؟" بچے نے کہا کہ "درخت سے گوند نکال رہا ہوں۔" اقبال نے پھر وہی مصرعہ پڑھ دیا۔ چھوٹے میاں سے نہ رہا گیا بولے "واہ! آپ کیسے شاعر ہیں ایک ہی مصرعہ پر آپ کی شاعری ختم ہوگئی ہے۔" اقبال نے یہ شکایت سنتے ہی شعر مکمل کر دیا اور کہا۔ ؎

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے — اور ہو گی اِن کی شادی کسی نیک بخت سے

کتے نہیں آدمی

فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:۔ میرے ایک قریبی رشتہ دار سید واحد علی کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "ابا جان! موٹر میں کتے آئے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا "نہیں بٹیا! یہ تو آدمی ہیں۔"

دیو محل

چودھری سر شہاب الدین سیاہ رنگ کے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی عالی شان کوٹھی تعمیر کرائی تو تمام احباب کو دعوت دی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے احباب سے پوچھا کہ اِس مکان کا کیا نام ہونا چاہیے۔ اقبال فوراً بول اُٹھے "دیو محل۔"

آموں کی رسید

اقبال کو آم بہت پسند تھے۔ ایک بار انھیں اکبر الٰہ آبادی نے الٰہ آباد سے آموں کا ایک ٹوکرا تحفے میں بھیجا۔ اقبال نے آموں کی رسید اِس شعر کی صورت میں انھیں بھیجی۔ ؎

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

خودداری، دیانت داری اور سادگی

اقبال غیرت اور خودداری کی تصویر تھے۔ خودداری کی انھوں نے صرف اپنی شاعری میں تعلیم ہی نہیں دی بلکہ خود بھی اس تعلیم پر عمل کیا۔ دیانت داری میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ دولت کی محبت میں گرفتار نہیں تھے بلکہ اپنی محنت سے جو کچھ وہ کماتے تھے اُس پر ہر سال بڑی باقاعدگی سے اِنکم ٹیکس دیتے تھے۔ انھوں نے رئیس نہ ہونے کے باوجود انکم ٹیکس کا روپیہ بچانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

اصل میں دیانت داری کی خوبی سادہ زندگی اور قناعت پسندی سے پیدا ہوتی ہے اقبال نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خوراک ہو یا لباس یا رہنا سہنا ان کی زندگی ایک درویش اور مردِ قلندر کی زندگی تھی۔

مکان

اقبال کا مکان سامانِ آرائش سے قطعی خالی تھا۔ اس میں قیمتی صوفے یا قیمتی قالین نظر نہ آتے تھے بلکہ ہر طرف سادگی ہی سادگی دکھائی دیتی تھی۔

ڈاکٹر اقبال کہاں ہیں؟

اقبال کی سادگی پسندی کا ذکر کرتے ہوئے فقیر وحیدالدین لکھتے ہیں
ایک بار ایک دھوبی آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا ملازم علی بخش دروازے پر کھڑا تھا۔ دھوبی نے

کہاں ہیں؟ ڈاکٹر اقبال کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب بنیان پہنے اور دھوتی باندھے گن میں
حقہ پی رہے تھے۔ علی بخش نے اشارے سے کہا "یہ ہیں ڈاکٹر صاحب"
دھوبی کو علی بخش کے کہنے کا یقین نہیں آیا۔ وہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب کو گھر ہی
کا کوئی معمولی آدمی سمجھ کر اُن سے پوچھنے لگا "ڈاکٹر اقبال کہاں ہیں، میں انھیں دیکھنا چاہتا
ہوں؟" ڈاکٹر صاحب اِس پر مسکرائے اور کہا ـــــ "بھئی میں ہی ہوں۔ آؤ بیٹھو ـــــ"
دھوبی سکتے میں آگیا ـــــ اتنا سادہ اور بے نیاز! بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا
"شہرت شہنشاہ ایسی اور رہنا سہنا درویش ایسا!"

لباس

لباس کے معاملے میں اقبال انتہائی بے پرواہی کی حد تک سادگی پسند رہے۔ اکثر ایسا
ہوتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے سلوانے کے لیے خود کپڑے والے یا درزی کی دکان تک جانے کی
تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اُن کا ملازم علی بخش بازار جاکر اپنی مرضی سے کپڑا خرید کے
درزی کو دے آتا تھا۔ درزی نے ایک بار اقبال کا ناپ لے لیا تھا۔ اسی ناپ کے مطابق
وہ کپڑے سی کر بھیج دیا کرتا تھا۔

خوراک

لباس اور رہنے سہنے کی طرح خوراک کے معاملے میں بھی آپ انتہائی طور پر سادگی
پسند تھے۔ نوجوانی کے زمانے میں اگرچہ خوش خوراک تھے لیکن چٹورپن سے دور۔
کھانا بالعموم دوپہر کو کھاتے تھے۔ وہ بھی ایک سالن اور دو چپاتیوں سے آگے
کبھی نہیں بڑھا۔ رات کو ناغہ۔ شروع میں تو رات کو دودھ پی لیا کرتے تھے۔ بعد میں اسے
بھی ترک کر دیا۔

سادہ زندگی کی برکتیں

پیارے بچو! یہ بات تو ہم پہلے ہی تم کو بتا چکے ہیں کہ اقبال نے سر آغا خان مرحوم کا پانچ سو روپیہ ماہوار کا عطیہ یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا تھا کہ مجھے ماہانہ پانچ سو روپیہ ملتا ہے زیادہ نہیں ہے اور یہ روپیہ مجھے نواب بھوپال کی طرف سے مل رہا ہے۔ زیادہ کی مجھے ضرورت نہیں۔ اگر اقبال سادہ زندگی بسر نہ کرتے تو مزید پانچ سو روپے ماہانہ لینے سے انکار نہ کر سکتے تھے کیونکہ جو شخص سادہ زندگی بسر نہیں کرتا اُسے ہر وقت روپے کی ضرورت رہتی ہے اور وہ جائز ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان نہ اپنی غیرت مندی باقی رکھ سکتا ہے نہ خودداری اور نہ دیانت داری۔ صرف سادہ زندگی بسر کرنے والا شخص ہی روپے پیسے کو حقیر سمجھ کر ٹھکرا سکتا ہے اور اقبال ایک ایسے ہی درویش صفت انسان تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حیدرآباد کے وزیرِ اعظم سر اکبر حیدری نے انھیں ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا۔ یہ چیک ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اسے قبول کرنا اقبال کی غیرت مندی نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے یہ چیک ان اشعار کے ساتھ سر اکبر حیدری کو واپس کر دیا۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز | دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر | حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اِس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش | کامِ درویش میں ہر تلخی ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

کلام کا انتخاب

بانگِ درا

بچے کی دعا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

ہمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اُڑنے چُگنے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سُن کر بُلبل کی آہ وزاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دِیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب بڑھا اور جس سے مرا اضطراب

یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں

لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا مُحال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے ۔۔۔ دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں ۔۔۔ خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر ۔۔۔ مجھے اُس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا ۔۔۔ دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں ۔۔۔ مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں ؟

جُدائی میں رہتی ہُوں میں بے قرار ۔۔۔ پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی ۔۔۔ گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی

جو بچے نے دیکھا مرا پیچ وتاب ۔۔۔ دیا اُس نے منہ پھیر کر یوں جواب

رُلاتی ہے تجھ کو جُدائی مری ۔۔۔ نہیں اِس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چُپ رہا ۔۔۔ دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہوگیا کیا اسے

ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

ایک گائے اور بکری

اک چراگہ ہری بھری تھی کہیں ۔۔۔ تھی سراپا بہار جس کی زمیں

کیا سماں اُس بہار کا ہو بیاں ۔۔۔ ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں

تھے اناروں کے بے شمار درخت ۔۔۔ اور پیپل کے سایہ دار درخت

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں ۔۔۔ طائروں کی صدائیں آتی تھیں

کسی ندی کے پاس اک بکری ۔۔۔ چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی

جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔۔۔ پاس اک گائے کو کھڑا پایا

پہلے جھک کر اُسے سلام کیا　　پھر سلیقے سے یوں کلام کیا

کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں　　گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی　　ہے مصیبت میں زندگی اپنی

جان پر آ بنی ہے کیا کہیے　　اپنی قسمت بُری ہے کیا کہیے!

دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں　　رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں

زور چلتا نہیں غریبوں کا　　پیش آیا لکھا نصیبوں کا

آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے　　اِس سے پالا پڑے خدا نہ کرے!

دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے　　ہوں جو دُبلی تو بیچ کھاتا ہے

ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے!　　کن فریبوں سے رام کرتا ہے!

اِس کے بچوں کو پالتی ہوں میں　　دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں

بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے　　مرے اللہ تری دُہائی ہے

سُن کے بکری یہ ماجرا سارا　　بولی، ایسا گلہ نہیں اچھا

بات سچی ہے بے مزا لگتی　　میں کہوں گی مگر خدا لگتی

یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　یہ ہری گھاس اور یہ سایا

ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں!　　یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں　　لطف سارے اُسی کے دم سے ہیں

اس کے دم سے ہے اپنی آبادی　　قید ہم کو بھلی کہ آزادی؟

سَو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا　　واں کی گزران سے بچائے خدا!

ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا　　ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو　　آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو

گائے سُن کر یہ بات شرمائی　　آدمی کے گلے سے پچھتائی

دل میں پرکھا بھلا بُرا اُس نے اور کچھ سوچ کر کہا اُس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

ایک مکڑا اور مکھی

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن مری کُٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا
اِس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اُترا
مکڑے نے کہا. واہ! فریبی مجھے سمجھے تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا
منظور تمہاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
اُڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں بُرا کیا!
اِس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کُٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا
مکھی نے کہا. خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن میں آپ کے گھر آؤں یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا تم کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اُٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اُس کی
پھانسوں اسے کس طرح یہ کم بخت ہے دانا

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رُتبا

ہوتی ہے اُسے آپ کی صورت سے محبت
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا

آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا

یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی!
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا

مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا

یہ بات کہی اور اُڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اُڑایا

ایک پہاڑ اور گلہری

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے اُس پر غرور کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ۔ یہ شعور! کیا کہنا

خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں!

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں جانور غریب کہاں

کہا یہ سُن کے گلہری نے منہ سنبھال زرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے اِنھیں نکال زرا

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اُس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے

قدم اُٹھانے کی طاقت ذرا نہیں تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہُنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں اب وہ اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں | میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی! دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے | دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے | دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا | ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں | سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا | وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں | گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو | اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا | ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے | اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری | صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

غیر مطبوعہ کلام

یہاں غیر مطبوعہ کلام سے وہ کلام مُراد ہے جو اقبال نے
خود اپنے کلام کے مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ اس طرح کا
غیر مطبوعہ کلام مختلف رسالوں، کتابوں اور مسودوں کی
صورت میں موجود ہے۔ (مؤلف)

شہد کی مکھی

اس پھول پہ بیٹھی کبھی اُس پھول پہ بیٹھی
بتلاؤ تو کیا ڈھونڈتی ہے شہد کی مکھی

کیوں آتی ہے کیا کام ہے گلزار میں اِس کا
یہ بات جو سمجھاؤ تو سمجھیں تمھیں دانا

چہکارتے پھرتے ہیں جو گلشن میں پرندے
کیا شہد کی مکھی کی [illegible] ان سے

عاشق ہے یہ قمری پہ کہ بلبل کی ہے شیدا
یا کھینچ کے لاتا ہے اسے سیر کا چسکا

دل باغ کی کلیوں سے تو اٹکا نہیں اس کا
بھاتا ہے اسے ان کے چٹکنے کا تماشا

سبزے سے ہے کچھ کام کہ مطلب ہے ہوا سے
یا پیار ہے گلشن کے پرندوں کی صدا سے

بھاتا ہے اسے پھول پہ بلبل کا چہکنا
یا سرو پہ بیٹھے ہوئے قمری کا یہ گانا

پیغام کوئی لاتی ہے بلبل کی زبانی؟
یا کہتی ہے یہ پھول کے کانوں میں کہانی

کیوں باغ میں آتی ہے؟ یہ بتلاؤ تو جانیں
کیا لینے کو آتی ہے یہ بتلاؤ تو جانیں

بے وجہ تو آخر کوئی آنا نہیں اس کا
ہشیار ہے مکھی اسے غافل نہ سمجھنا

بے سود نہیں باغ میں اس شوق سے اُڑنا
کچھ کھیل میں یہ وقت گنواتی نہیں اپنا

کرتی نہیں کچھ کام اگر عقل تمہاری
ہم تم کو بتلاتے ہیں سنو بات ہماری

کہتے ہیں جسے شہد وہ اک طرح کا رس ہے
آوارہ اسی چیز کی خاطر یہ مگس ہے

رکھا ہے خدا نے اسے پھولوں میں چھپا کر
مکھی اسے لے جاتی ہے چھتے میں اُڑا کر

ہر پھول سے یہ چوستی پھرتی ہے اسی کو
یہ کام بڑا ہے اسے بے سود نہ جانو

مکھی یہ نہیں ہے کوئی نعمت ہے خدا کی
ملتا نہ ہمیں شہد، یہ مکھی جو نہ ہوتی

اس شہد کو پھولوں سے اُڑاتی ہے یہ مکھی
خود کھاتی ہے اوروں کو کھلاتی ہے یہ مکھی

انسان کی یہ چیز غذا بھی ہے، دوا بھی
قوت ہے اگر اس میں تو ہے اس میں شفا بھی

رکھتے ہو اگر ہوش تو اس بات کو سمجھو — تم شہد کی مکھی کی طرح علم کو ڈھونڈو
یہ علم بھی اک شہد ہے اور شہد بھی ایسا — دنیا میں نہیں شہد کوئی اس سے مصفّا
ہر شہد سے جو شہد ہے میٹھا وہ یہی ہے — کرتا ہے جو انسان کو دانا وہ یہی ہے
یہ عقل کے آئینے کو دیتا ہے صفائی — یہ شہد ہے انساں کی وہ مکھی کی کمائی
سچ سمجھو تو انسان کی عظمت ہے اسی سے — اس خاک کے پُتلے کو سنوارا ہے اسی نے

پھولوں کی طرح اپنی کتابوں کو سمجھنا
چسکا ہو اگر تم کو بھی کچھ علم کے رس کا

جہاں تک ہو سکے نیکی کرو

کہتے ہیں ایک سال نہ بارش ہوئی کہیں — گرمی سے آفتاب کی تپنے لگی زمیں
تھا آسمان پر نہ کہیں ابر کا نشاں — پانی ملا نہ جب تو ہوئیں خشک کھیتیاں
لالے پڑے ہوئے تھے جان کے ہر جاندار کو — اُجڑے چمن، ترستے ترستے بہار کو
منہ تک رہی تھی خشک زمیں آسمان کا — امید ساتھ چھوڑ چکی تھی کسان کا
بارش کی کچھ امید نہ تھی اس غریب کو — یہ حال تھا کہ جیسے کوئی سوگوار ہو
اک دن جو اپنے کھیت میں آکر کھڑا ہوا — پودوں کا حال دیکھ کے بیتاب ہو گیا
ہر بار آسماں کی طرف دیکھتا تھا وہ — بارش کے انتظار میں گھبرا رہا تھا وہ
ناگاہ ایک ابر کا ٹکڑا نظر پڑا — لاتی تھی اپنے ساتھ اُڑا کر جسے ہوا

پانی کی ایک بوند نے تاکا اِدھر اُدھر ۔۔۔ بولی وہ اس کسان کی حالت کو دیکھ کر
ویران ہو گئی ہے جو کھیتی غریب کی ۔۔۔ ہے آسمان پر نظر اس بد نصیب کی
دل میں یہ آرزو ہے کہ اس کا بھلا کروں ۔۔۔ یعنی برس کے کھیت کو اس کے ہرا کروں
بوندوں نے جب سنی یہ سہیلی کی گفتگو! ۔۔۔ ہنس کر دیا جواب کہ اللہ رے آرزو!
تو اک ذرا سی بوند ہے اتنا بڑا یہ کھیت ۔۔۔ تیرے ذرا سے نم سے نہ ہوگا ہرا یہ کھیت
تیری بساط کیا ہے کہ اس کو ہرا کرے ۔۔۔ ہو خود جو ہیچ کیا وہ کسی کا بھلا کرے!
اس بوند نے مگر یہ بگڑ کر دیا جواب ۔۔۔ کہہ دی وہ بات جس نے کیا سب کو لاجواب
مانا کہ ایک بوند ہوں دریا نہیں ہوں میں ۔۔۔ قطرہ ذرا سا ہوں کوئی چھینٹا نہیں ہوں میں
مانا کہ میرا نم کوئی دریا کا نم نہیں ۔۔۔ ہمت تو میری بحر کی ہمت سے کم نہیں
نیکی کی راہ میں کبھی ہمت نہ ہاریے ۔۔۔ مقدور ہو تو عمر اسی میں گزاریے
قربان اپنی جان کروں گی کسان پر ۔۔۔ کیا لوں گی میں ٹھہر کے یہاں آسمان پر
نیکی کے کام سے کبھی رُکنا نہ چاہیے ۔۔۔ اس میں کسی کے ساتھ کی پروا نہ چاہیے
لو، میں چلی یہ کہہ کے روانہ ہوئی وہ بوند ۔۔۔ بوندوں کی انجمن میں یگانہ ہوئی وہ بوند
ٹپ کر کے اُس کی ناک پہ وہ بوند گر پڑی ۔۔۔ سوکھی ہوئی کسان کے دل کی کلی کھلی!
دیکھا سہیلیوں نے تو حیران ہو گئیں ۔۔۔ ہمت کے اِس کمال پہ کی سب نے آفریں
بولیں کہ چاہیے نہ سہیلی کو چھوڑنا ۔۔۔ اچھا نہیں ہے منہ کو رفاقت سے موڑنا
ساتھی کے ساتھ سب کو برسنا ضرور ہے ۔۔۔ گر ہم نہ ساتھ دیں تو مروّت سے دور ہے
یہ کہہ کے ایک ساتھ وہ بوندیں رواں ہوئیں ۔۔۔ چھینٹا سا بن کے کھیت کے اوپر برس گئیں
قسمت کھلی کسان کی، بگڑی ہوئی بنی! ۔۔۔ سوکھی ہوئی غریب کی کھیتی ہری ہوئی!
پھر سامنے نظر کے بندھا آس کا سماں ۔۔۔ تھی آس آس پاس گیا یاس کا سماں
اُجڑا ہوا جو کھیت تھا آخر ہرا ہوا ۔۔۔ سارا یہ ایک بوند کی ہمت کا کام تھا

دیکھی گئی نہ اس سے مصیبت کسان کی ۔۔۔ بے تاب ہو کے کھیت پہ اُسکے برس گئی

ننھی سی بوند اور یہ ہمت خدا کی شان

یہ فیض، یہ کرم، یہ مروت، خدا کی شان

چند نصیحتیں

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں ۔۔۔ اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیے

مل نہیں سکتی نکموں کو زمانے میں مُراد ۔۔۔ کامیابی کی جو خواہش ہو تو محنت چاہیے

خاک محنت ہو سکے گی ہو نہ جب ہاتھوں میں زور ۔۔۔ تندرستی کے لیے ورزش کی عادت چاہیے

خوش مزاجی سا زمانے میں کوئی جادو نہیں ۔۔۔ ہر کوئی تحسیں کہے ایسی طبیعت چاہیے

ہنس کے ملنا رام کر لینا ہے ہر انسان کو ۔۔۔ سب سے میٹھا بولنے کی تمکو عادت چاہیے

ایک ہی اللہ کے بندے ہیں سب چھوٹے بڑے ۔۔۔ اپنے ہم جنسوں سے دنیا میں محبت چاہیے

ہے بُرائی سی بُرائی کام کل پر چھوڑنا ۔۔۔ آج سب کچھ کر کے اٹھو گر فراغت چاہیے

جو بُروں کے پاس بیٹھے گا بُرا ہو جائے گا ۔۔۔ نیک ہونے کے لیے نیکوں کی صحبت چاہیے

ساتھ والے دیکھنا تم سے نہ بڑھ جائیں کہیں ۔۔۔ جوش ایسا چاہیے ایسی حمیت چاہیے

حکمراں ہو کوئی ہو اپنا ہو یا بیگانہ ہو ۔۔۔ دی خدا نے جس کو عزت اسکی عزت چاہیے

دیکھ کر چلنا کچل جائے نہ چیونٹی راہ میں ۔۔۔ آدمی کو بے زبانوں سے بھی اُلفت چاہیے

ہے اسی میں بھید عزت کا اگر سمجھے کوئی ۔۔۔ چھوٹے بچوں کو بزرگوں کی اطاعت چاہیے

علم کہتے ہیں جسے سب سے بڑی دولت ہے یہ ۔۔۔ ڈھونڈ لو اس کو اگر دنیا میں عزت چاہیے

سب بُرا کہتے ہیں لڑنے کو بُری عادت ہے یہ ۔۔۔ ساتھ کے لڑکے جو ہوں اُن سے رفاقت چاہیے

ہوں جماعت میں شرارت کرنے والے کبھی اگر
دور کی اُن سے فقط صاحب سلامت چاہیے

دیکھنا آپس میں پھر نفرت نہ ہو جائے کہیں
اس قدر حد سے زیادہ بھی نہ ملت چاہیے

باپ دادوں کی بڑائی پر نہ اترانا کبھی
سب بڑائی اپنی محنت کی بدولت چاہیے

چاہتے ہو گر کہ سب چھوٹے بڑے عزت کریں
شرم آنکھوں میں نگاہوں میں مروت چاہیے

بات اونچی ذات میں بھی کوئی اترانے کی ہے ؟
آدمی کو اپنے کاموں کی شرافت چاہیے

گر کتابیں ہو گئیں میلی تو کیا پڑھنے کا لطف
کام کی چیزیں ہیں جو اُن کی حفاظت چاہیے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

ISBN: 978-81-7587-407-7

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110025